بسم اللہ الرحمن الرحیم

دینِ اسلام کا مزاج اور اس کی نمایاں خصوصیات

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دینِ اسلام کا مزاج اور اس کی نمایاں خصوصیات

از :- حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب مدظلہ

اس کائنات میں ہر زندہ اور متحرک شئے کا ایک خاص مزاج، کچھ نمایاں خصوصیات اور ابھرے ہوئے خطّ وخال ہوتے ہیں، جن سے اس کی شخصیت کی تشکیل اور اس کا تعیّن ہوتا ہے اور وہ اس کی صفاتِ مُمیّزہ قرار پاتی ہیں۔ اس میں افراد، جماعتیں، ملّتیں اور قومیں، مذاہب اور فلسفے یکساں طور پر شریک ہیں۔ وہ سب اپنی کچھ امتیازی خصوصیّات اور نمایاں علامات رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ دریافت اور تحقیق حق بجانب ہے کہ اس دین (اسلام) کی صفاتِ مُمیّزہ اور اس کی شخصیّت کے صحیح خطّ وخال کیا ہیں؟ دین کی تفصیلات تعلیمات، ہدایات اور مُعیّن قوانین وضوابط کے مطالعہ اور جستجو سے پہلے ہمیں اس حقیقت سے باخبر ہوجانا چاہیئے کیونکہ دین سے مکمل

طور پر فائدہ اٹھانے اور اس کے رنگ میں رنگ جانے کے لئے یہی فطری طریقہ اور اس کے قفل کی شاہ کلید ہے۔

سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ یہ دین ہم تک حکیموں اور دانشوروں، ماہرینِ قانون، علمائے اخلاق ونفسیات، کشورکشا اور قانون ساز، بانیانِ سلطنت، خیالی گھوڑے دوڑانے والے فلاسفہ اور طالع آزما سیاسی رہنماؤں اور طالع آزما اور قوموں کے قائدین کے ذریعہ نہیں پہنچا۔ یہ دین ہم تک ان انبیائے کرامؑ کے ذریعہ پہنچا ہے، جن کے پاس خدائے تعالیٰ کی وحی آتی تھی اور جن کا سلسلہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوچکا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر عرفات کے دن یہ آیت نازل ہوئی تھی

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (مائدہ : ۳)

(ترجمہ) آج ہم نے تمہارے لئے دین کامل کردیا، اور اپنی نعمت تم پر پوری کردی، اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

اور جن کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے :-

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○

(النجم : ۳-۴)

(ترجمہ) اور نہ خواہشِ نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں، یہ (قرآن)

تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔

اس دین کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار، عقیدہ پر زور اصرار، اور سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل کر لینے کی تاکید ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرام ایک معین عقیدے کی (جو اُن کو وحی کے ذریعہ مِلا تھا) دعوت دیتے اور ان کا مطالبہ کرتے رہے اور اس کے مقابلہ میں کسی مفاہمت یا دست برداری پر تیار نہ ہوئے۔ ان کے نزدیک بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی اور اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی کردار کا حامل نیکی وصلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ پیکر اور مثالی مجسمہ خواہ اس سے بہتر کسی حکومت کا قیام، کسی صالح معاشرہ کا وجود اور کسی مفید انقلاب کا قیام وظہور ہوا ہو اس وقت تک کوئی قدر وقیمت نہیں رکھتا، جب تک وہ اس عقیدہ کا ماننے والا نہ ہو، جس کو لیکر آئے، اور جس کی دعوت ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔ اور جب تک اس کی یہ ساری کوششیں اور کاوشیں صرف اس عقیدہ کی بنیاد پر نہ ہوں۔ یہی وہ حدِ فاصل اور واضح و روشن خط ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت اور قومی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں، انقلابیوں اور ہر اس شخص کے درمیان کھینچ دیا گیا ہے جس کا سرچشمۂ فکر و نظر انبیائے کرامؑ کے تعلیمات اور سیرتوں کے بجائے کوئی اور ہو[1]۔

---

[1] موجودہ دور کے بگڑے ہوئے حالات سے دل برداشتہ بہت سے (باقی صفحہ پر)

قرآن مجید جو تحریف سے محفوظ اور قیامت تک باقی رہنے والی واحد آسمانی کتاب ہے اور سیرتِ خاتم النبیینؐ جو انبیائے کرامؑ کی سیرتوں میں تنہا وہ سیرت ہے جس پر تاریخی و علمی طور پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور جس سے ہر دور میں عملی استفادہ ممکن ہے، اس حقیقت اور دعوے کے بکثرت شواہد و دلائل فراہم کرتے ہیں۔ ذیل میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے:۔

اس سلسلہ میں سب سے نمایاں وہ آیتِ کریمہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیِ و خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تحمّل اور نرم دلی کی خاص طور پر تعریف کی ہے:۔

إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ ۝ (ھود - ۷۵)

(ترجمہ) بیشک ابراہیمؑ بڑے تحمّل والے، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرٰهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهٗ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ كَفَرْنَا

لوگوں کے اندر یہ مزاج پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر اس شخص کے جو انقلاب کا نعرہ لگائے یا کسی بڑی طاقت کو چیلنج کرے، عقیدہ کے ہر بگاڑ اور افکار و نظریات کی ہر کجی اور انحراف کو معاف کر دیتے ہیں اور عقیدہ کے مسئلہ سے بالکل صرف نظر کر دیتے ہیں، بلکہ اُلٹے ان لوگوں کو ہدفِ ملامت بنا لیتے ہیں، اور کبھی باطل طاقتوں سے سازباز کر لینے کا الزام بھی لگاتے ہیں، جو اس موقع پر عقیدہ کی بحث کو اٹھاتے ہیں۔ اور اس شخص کے عقائد کے بارے میں کوئی سوال کریں، یہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل صحیح دینی مزاج اور نبوی طریق سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ
أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرٰهِيمَ
لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ
شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ
الْمَصِيرُ ۝ (الممتحنۃ ۔ ۴)

(ترجمہ) تمہیں ابراہیم اور ان کے رفقاء کی نیک چال چلنی (ضرور) ہے، جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان بتوں سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بے تعلق ہیں (اور تمہارے معبودوں کے (کبھی) قائل نہیں ہو سکتے اور جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ ہم تم میں ہمیشہ کھلم کھلا عداوت اور دشمنی رہے گی۔ ہاں ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے یہ (ضرور) کہا کہ میں آپ کے لئے مغفرت مانگوں گا[1] اور میں خدا کے سامنے آپ کے بارے میں کسی چیز کا کچھ اختیار نہیں رکھتا، اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہمارا بھروسہ ہے، اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں اور تیرے ہی حضور میں ہمیں لوٹ جانا ہے۔

[1] شاید بعض دلوں میں یہ خلجان پیدا ہو کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ سے دعا و استغفار کا وعدہ کیوں کیا؟ اس کا جواب سورۃ براۃ کی آیات ۱۱۳، ۱۱۴ میں موجود ہے کہ انھوں نے اس وعدہ کا ایفا کیا، لیکن جب ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے اور انھوں نے اظہار براۃ کیا اور اب ہمیشہ کے لئے یہ اصول بنا دیا

عقیدہ کی اہمیت اور وصل و فصل کا معیار ہونے کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ سورۃ الکافرون مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی جب حالات نرمی، تلطف اور عبادت و عقیدہ کی بنیاد پر دشمنی نہ کرنے، اور اس مسئلہ کو اس وقت تک کے لئے ملتوی رکھنے کے متقاضی تھے۔ جب اسلام کو طاقت حاصل ہو جائے اور معتدل و پُرسکون حالات ہوں، لیکن قرآن صاف صاف کہتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھل کر اعلان کرتے ہیں :-

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ ۝ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝ (سورۃ الکافرون)

(ترجمہ) اے پیغمبر! ان منکرانِ اسلام سے کہدو کہ اے کافرو جن (بتوں) کو تم پوجتے ہو، میں نہیں پوجتا اور جس (خدا) کی میں عبادت کرتا ہوں، اس کی تم عبادت نہیں کرتے، اور میں پھر کہتا ہوں کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو، انکی میں پرستش کرنے والا نہیں ہوں اور نہ تم اس کی بندگی کرنے والے (معلوم ہوتے) ہو جس کی میں بندگی کرتا ہوں، تم اپنے دین پر، میں اپنے دین پر -

واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی اس کا مستحق تھا کہ اس کے عقیدہ سے

صرف نظر کرلیا جائے کیونکہ وہ زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سینہ سپر اور جان و مال سے قربان رہا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب تھے۔ سیرت نگار بالاتفاق ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سپر اور حصار بنے ہوئے تھے۔ اور اپنی پوری قوم کے خلاف آپؐ کے ممد و معاون اور ناصر و حامی تھے، لیکن صحیح روایتوں میں یہ ثابت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کی موت کے وقت جبکہ ابو جہل اور عبداللہ بن ابی اُمیہ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے، ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ "اے چچا، آپ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دیجئے، میں اس کلمہ کی خدا تعالیٰ کے یہاں گواہی دوں گا" تو ابو جہل اور ابن ابی اُمیہ کہنے لگے، ابو طالب! کیا تم عبدالمطّلب کے مذہب سے روگردانی کروگے؟ تو ابو طالب نے یہ کہتے ہوئے جان دی کہ عبدالمطّلب کے مذہب پر ہوں۔

صحیح روایات میں آتا ہے کہ حضرت عبّاس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ابو طالب آپؐ کی حفاظت اور مدد کرتے تھے اور آپ کے بارے میں ان کے اندر بڑی حمیت تھی، جس کی بنا پر وہ لوگوں کی رضامندی اور ناراضگی کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے، تو کیا اس کا فائدہ ان کو پہنچے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے ان کو آگ کی لپٹوں میں پایا، اور معمولی آگ تک نکال لایا۔ (مسلم، کتاب الایمان)

اسی طرح امام مسلم نے بروایت حضرۃ حفصہ حضرۃ عائشہ رضی اللہ عنہا نقل کیا ہے کہ وہ کہتی ہیں: میں نے کہا اے اللہ کے رسول ابن جدعان جاہلیت کے زمانہ میں بڑی صلہ رحمی کرتے تھے، مسکینوں اور غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے، تو کیا ان کے لئے یہ سودمند ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، اُن کو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا، کیونکہ انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ

رَبِّ اغْفِرْلِي خَطِيْئَتِي يَوْمَ الدِّيْنِ (صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر)

(ترجمہ) اے میرے رب! روز جزا میرا گناہ بخش دیجیے گا

اس سے بھی زیادہ صریح اور واضح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک دوسری روایت ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کی طرف روانہ ہوئے اور جب مقام حرۃ الوبرہ پر پہنچے تو ایک شخص آیا جس کی جرأت و بہادری مشہور زمانہ تھی، اس کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ کو بڑی مسرت ہوئی (کہ اس سے لشکر اسلام میں، جو صرف تین سو تیرہ ۳۱۳ پر مشتمل تھا، ایک وقیع اضافہ ہوگا، اس وقت ایک آدمی کی بھی بڑی قیمت تھی چہ جائیکہ ایک آزمودہ کار سپاہی) جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو اس نے عرض کیا کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آپؐ کے ساتھ چلوں اور مال غنیمت میں شریک ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہو، اس نے کہا نہیں، آپؐ نے فرمایا واپس جاؤ۔ اس لئے کہ میں کسی مشرک سے مدد نہیں لے سکتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

کہتی ہیں کہ وہ کچھ دور چلا یہاں تک کہ ہم لوگ جب مقام شجرہ پر تھے، وہ پھر آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی پہلی بات عرض کی، آپ نے وہی پہلا جواب دیا، فرمایا جاؤ میں مشرک سے مدد نہیں لیتا، وہ چلا گیا اور بیداء پہنچنے پر پھر آیا، آپ نے پھر دریافت فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہو؟ اس نے کہا ہاں! اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تو چلو۔" (صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر)

(۲) دوسری بات یہ کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی (جن میں سرفہرست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے) دعوت وتبلیغ اور جہد وجہاد کا حقیقی محرک اور سبب محض خدائے تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی طلب ہوتی ہے یہ ایک ایسی تیز تلوار ہے جو اس مقصدِ اعلیٰ کے علاوہ ہر مقصد کو کاٹتی اور نیست ونابود کر دیتی ہے، پھر نہ متاعِ دنیا کی طلب رہتی ہے اور نہ ملک ودولت اور سلطنت و ریاست کی چاہت، نہ سربلندی اور عزت کی خواہش، نہ غلبہ واقتدار کی ہوس، نہ سربلندیٔ مال ومنال اور عیش وتنعم کی تمنا، نہ غضب وانتقام کا جذبہ، نہ جاہلی حمیت کا جوش۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ان کو جد وجہد اور جہاد پر نہیں اُبھارتی۔

یہ حقیقت سب سے روشن ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعاء میں جھلکتی ہے، جو آپ نے طائف میں ——— اس وقت کی تھی، جب اہل طائف نے آپ کے ساتھ ایسا جفا کارانہ اور وحشیانہ برتاؤ کیا تھا جس کی مثال دعوت ورسالت کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ آپ جس مقصد کے لئے وہاں تشریف لے گئے

تھے، وہ بظاہر پورا نہیں ہوا، طائف کا ایک شخص بھی حلقہ بگوش اسلام نہ ہوا اس نازک گھڑی اور سخت نفسیاتی حالت میں جو دعائیہ کلمات آپؐ کے دہنِ مبارک سے نکلے تھے وہ یہ تھے :-

اللّٰھُمَّ اِلَیْكَ اَشْكُو ضُعْفَ قُوَّتِی وَقِلَّةَ حِیْلَتِی، وَ هَوَانِی عَلَی النَّاسِ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِینَ، اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّی اِلٰی مَنْ تَکِلُنِی، اِلٰی عَدُوٍّ یَتَجَهَّمُنِی اَمْ اِلٰی قَرِیْبٍ مَلَّکْتَهٗ اَمْرِی

(ترجمہ) "الٰہی! اپنی کمزوری، بے سروسامانی، اور لوگوں میں تحقیر کی بابت تیرے سامنے میں فریاد کرتا ہوں، تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، درماندہ اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے، اور میرا مالک بھی تو ہی ہے، مجھے کس کے سپرد کر رہے ہیں؟ کیا بیگانہ وترش رو کے، یا اس دشمن کے جو کام پر قابو رکھتا ہے"۔

اس نقطہ پر آکر وہ نبوی مزاج، جس کی پرورش و پرداخت دستِ قدرت نے کی تھی پوری طرح جھلک اٹھتا ہے، آپؐ فرماتے ہیں :-

ان لم یکن بِكَ غَضَبٌ عَلَیَّ فَلَا اُبَالِی غیر ان عَافِیَتَكَ ھی اوسعُ لِی [1]

(ترجمہ) "اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے بھی اس کی پرواہ نہیں، لیکن تیری عافیت میرے لئے زیادہ وسیع ہے"۔

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۰۲ - السیرة النبویة، ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۰

نوح علیہ السلام کو دیکھیے، جو اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں، اور جن کے بارے میں قرآن کریم کی شہادت ہے:

فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا۔ (سورۂ عنکبوت۔۱۴)۔

(ترجمہ) "وہ اپنی قوم میں پچاس برس کم ہزار برس رہے"۔

جنھوں نے یہ طویل مدت دعوت تبلیغ کے کام میں ہمہ تن معروف رہ کر، اور لوگوں کو مطمئن کرنے کے تمام مناسب طریقے اختیار کرکے گذاری، قرآن خود ان کا قول نقل کرتا ہے:

قَالَ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۝

(ترجمہ) "(نوحؑ) نے خدا سے عرض کی کہ پروردگار! میں اپنی قوم کو رات رات دن بلاتا رہا" (سورہ نوح۔ ۵)

آگے فرماتے ہیں:

ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝ (سورہ نوح۔۸۔۹)

(ترجمہ) "پھر میں انکو کھلے طور بھی بلاتا رہا اور ظاہر و پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا"

لیکن اس طویل اور زہرہ گداز محنت اور محبت کا نتیجہ کیا رہا؟

وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ (سورہ ھود۔۴۰)

(ترجمہ) "ان کے ساتھ ایمان بہت ہی کم لوگ لائے"

لیکن حضرت نوح علیہ السلام اس پریشانی یا افسردہ خاطر نظر نہیں آتے،

اور اپنی محنت کو رائیگاں نہیں سمجھتے، اور نہ اس سے خدا کے یہاں ان کے مقام درجۂ قرب اور اولوالعزم پیغمبر ہونے میں کچھ فرق آتا ہے، خدا ان سے راضی تھا، اور وہ اپنے خدا سے راضی تھے، خدا کا پیغام انھوں نے خدا کے بندوں تک پہنچا دیا تھا، اور راہ خدا میں وہ کوشش کا حق ادا کر چکے تھے جس کے انعام میں یہ تمغہ قرآنی ان کو ملا :-

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝ سَلَامٌ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ ۝ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝-

(ترجمہ) "اور پیچھے آنے والوں میں ان کا ذکر (جمیل باقی) چھوڑ دیا یعنی تمام جہاں میں نوحؑ پر سلام ہو، نیکوکاروں کو ہم ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے"

(سورۂ صافات : ۷۸-۸۱)

قرآن کریم دعوت و تبلیغ اور جہد و جہاد کے میدان میں تمام کام کرنے والوں کو یہ تعلیم دیتا، اور یہ آداب سکھاتا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝

(سورہ قصص -۸۳)

(ترجمہ) "وہ جو آخرت کا گھر ہے، ہم نے اسے ان لوگوں کے لئے تیار کر رکھا ہے جو ملک میں ظلم اور فساد کا ارادہ نہیں کرتے،

اور انجام نیک پرہیزگاروں ہی کا ہے "

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہے وہ قوت و طاقت جس کے ذریعہ مسلمان احکام خداوندی کا نفاذ کرسکتا ہے، اور دعوت کی راہ میں پیش آنے والی رکاوٹیں کو ہٹا سکتا ہے، اور جس کے ذریعہ زمین میں فساد اور ظلم اور باطل کے غلبہ کی آگ بجھا سکتا ہے، مثالی اسلامی زندگی، اور شریف و متدین ایمانی معاشرہ کے لئے سازگار ماحول تیار ہوسکتا ہے، وہ قابل توجہ اور لائق فکر و اہتمام نہیں، ہرگز نہیں، یہ تصور غیر اسلامی ہے، اور اس رہبانیت کا پرتو ہے جس کے لئے خدائے تعالیٰ نے کوئی دلیل اور سند نازل نہیں فرمائی، اللہ تعالیٰ اپنے احسان و انعام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْـــًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۠ (سورہ نور - ۵۵)

(ترجمہ) " جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیساکہ ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے

اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، مستحکم اور پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد امن کو بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے، اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے، اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکار ہیں۔"

یہ بھی ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ج (الانفال - ۳۹)

ترجمہ: "اور ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔"

اور یہ بھی فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (سورۃ الحج - ۴۱)

ترجمہ: "یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اور نیک کام کرنے کا حکم دیں، اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لئے سربلندی اور عزت و غلبہ کا وعدہ فرمایا ہے، لیکن اس شرط پر کہ وہ ایمانی صفات سے متصف ہوں، اور

ان کا مقصد عمل صرف رضائے خداوندی ہو، نہ کہ عزت واقتدار کا حصول اور اس کے لئے کوشش، کیونکہ عزت واقتدار نتیجہ ہے، نہ مقصد انعام ہے نہ کہ غرض وغایت، ارشاد ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (سورة آل عمران - ۱۳۹)

ترجمہ "اور (دیکھو) بے دل نہ ہونا، اور نہ کسی طرح کا غم کرنا، اگر تم مؤمن (صادق) ہو تو تمہیں غالب رہو گے"

قرآن کریم نے جگہ جگہ اس کی صراحت فرمائی ہے کہ خدا کی طرف سے اپنے بندے سے جس کا مطالبہ ہے، اور جو چیز اس کے یہاں کارآمد ہے وہ قلب سلیم ہے۔ اس کا ارشاد ہے:۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ○ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ○ (سورة الشعراء - ۸۸، ۸۹)

ترجمہ جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا، نہ اولاد، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لیکر آیا (وہ بچ جائیگا)۔

اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (الصّٰفّٰت - ۸۴)

ترجمہ جب وہ اپنے پروردگار کے پاس عیب سے پاک دل لے کر آئے"

اس لئے ہر اس چیز سے جو قلب سلیم کے منافی ہو، اور جس کے صنم و معبود بن جانے کا خطرہ ہو، اور جو خدائے عزّ وجل کی محبّت میں شریک وسہیم ہو، اس سے چوکنّا رہنے کی ضرورت ہے اور اس سے ہر قیمت پر بچنا لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰىهُ ط (الفرقان ۴۳)

ترجمہ: کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنے خواہش نفس کو معبود بنا رکھا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

إِنَّ الشَّيْطٰنَ يَجْرِيْ مِنِ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ

ترجمہ: شیطان ابن آدم کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔

(۳) دین کی تیسری خصوصیّت یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصّلوٰۃ والسلام ان عقائد، دعوت و پیغام اور شریعت کے بارے میں جس کو وہ لیکر آتے ہیں، بڑے غیور اور ذکی الحس واقع ہوتے ہیں، وہ کسی حال میں بھی (خواہ دعوت کی مقبولیّت اور کامیابی کی مصلحت ہی کا تقاضہ کیوں نہ ہو) اس کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ اپنی دعوت اور شریعت میں کوئی ترمیم یا تغیّر و تبدّل گوارا کریں، ان کے یہاں مداہنت اور تبدیلیٔ موقف کی گنجائش نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ اپنے آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مخاطب کرکے فرماتا ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (الحجر ۹۴)

(ترجمہ) پس جو حکم تم کو خدا کی طرف سے ملا ہے، وہ سنادو اور مشرکوں کا ذرا خیال نہ کرو۔ نیز ارشاد ہے:

يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط (سورۃ المائدۃ - ۶۷)

(ترجمہ) "اے پیغمبر! جو ارشادات تم پر خدا کی طرف سے نازل ہوتے ہیں، سب لوگوں کو پہنچادو، اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے، اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔"

نیز فرمایا:

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ○ (سورۃ القلم - ۹)

(ترجمہ) "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم نرمی اختیار کرو، تو یہ بھی نرم ہو جائیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا موقف توحید بلکہ اسلام کے بنیادی عقائد، حتیٰ کہ دین کے ارکان و فرائض کے بارے میں بھی لچک دار اور مصالحانہ موقف نہ تھا جو سیاسی قائدین کا (جو بزعم خود اپنے کو حقیقت پسند اور عملی انسان سمجھتے ہیں) ہر زمانہ میں طرۂ امتیاز رہا ہے، شہر طائف کے فتح ہو جانے کے بعد عرب

کے دوسرے سربرآوردہ قبیلۂ ثقیف کا وفد اسلام قبول کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ اور یہ درخواست کرتا ہے کہ لات نامی صنم کو، (جس کی وجہ سے طائف کو مکہ کے بعد مرکزیت اور تقدس حاصل تھا) تین سال تک اپنے حال پر رہنے دیا جائے اور دوسرے اصنام کی طرح اس کے ساتھ معاملہ نہ کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاف انکار فرما دیتے ہیں وفد کے لوگ دو سال، پھر ایک سال کی مہلت مانگتے ہیں، آپؐ مسلسل انکار فرماتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اس پر اُتر آتے ہیں کہ ہمارے طائف واپس جانے کے بعد صرف ایک مہینہ کی مہلت دیدی جائے، لیکن آپؐ ان کی آخری درخواست قبول فرمانے کے بجائے ابوسفیان بن حرب (جن کی طائف میں رشتہ داری تھی) اور قبیلہ ثقیف کے ہی کے ایک فرد مُغیرہ بن شعبہ کو مامور فرماتے ہیں، کہ وہ جائیں اور لاتؔ اور اس کے معبد کو ڈھادیں، اہلِ وفد ایک درخواست یہ بھی کرتے ہیں کہ انھیں نماز سے معاف رکھا جائے آپؐ فرماتے ہیں اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں نماز نہیں اس گفتگو سے فارغ ہوکر وہ اپنے وطن واپس لوٹتے ہیں اور ان کے ساتھ ابوسفیانؓ اور مُغیرہؓ بھی جاتے ہیں اور لاتؔ کو ڈھادیتے ہیں، اور پورے قبیلۂ ثقیف میں اسلام پھیل جاتا ہے یہاں تک کہ پورا طائف مسلمان ہو جاتا ہے[1]

[1] زاد المعاد، ج ۱- ص ۴۵۸ - ۴۵۹ باختصار

انبیاء کرام علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کی یہ بھی خصوصیّت ہے کہ وہ تبلیغ و دعوت اور اپنی تفہیم و مکالمہ میں وہی اسلوب اور وہی تعبیرات استعمال کرتے ہیں، جو ان کی دعوت کی رُوح اور نبوّت کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتی ہیں، وہ کھل کر پوری وضاحت کے ساتھ آخرت کی دعوت دیتے ہیں، جنّت اور اس کی نعمتوں اور لذّتوں کا شوق دلاتے ہیں، دوزخ اور اس کے عذاب اور اس کی ہولناکیوں سے ڈراتے ہیں، اور جنت دوزخ دونوں کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں گویا وہ نگاہوں کے سامنے ہیں وہ عقلی دلائل و براہین، اور مصالح و مفادات کے بجائے ایمان بالغیب کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ان کا عہد بھی مادّی فلسفوں اور نظریات سے (جو ان کے عہد کی سطح اور حالات کے مطابق ہوتے ہیں) یکسر خالی نہیں ہوتا اس عہد میں بھی کچھ طبقوں کی خاص اصطلاحات ہوتی ہیں، وہ ان سے ناواقف نہیں ہوتے، وہ یہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ یہ فلسفے اور اصطلاحات سکّۂ رائج الوقت ہے، اور انہیں کا اس دور میں چلن ہے، لیکن لوگوں کو قریب کرنے اور اپنی طرف آنے کی دعوت دینے کے لئے وہ ان سے کام نہیں لیتے، وہ اللہ تعالیٰ پر اس کی صفات و افعال کے ساتھ ملائکہ پر، تقدیر پر (شر ہو یا خیر) موت کے بعد اٹھائے جانے پر ایمان کی دعوت دیتے ہیں

وہ بغیر کسی تردد اور معذرت کے یہ اعلان کرتے ہیں، کہ ان کی دعوت قبول کرنے، اور ان پر ایمان لانے کا انعام جنّت اور خدا تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہے۔

دعوت کے سلسلہ میں نبوی مزاج و منہاج اور طریقہ کار کی بہترین مثال بیعت عقبہ ثانیہ کا واقعہ ہے، جب اہل یثرب کی ایک تعداد جن میں ۷۳ مرد اور دو عورتیں تھیں، حج کے لئے مکہ معظمہ آئے اور عقبہ کے پاس وادی میں اکٹھا ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عم محترم حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے ساتھ، جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) تشریف لائے تھے، آپؐ نے قرآن پاک کی آیات تلاوت فرمائیں، خدائے واحد کی طرف دعوت اور اسلام کی ترغیب دی، اور فرمایا کہ تم سے میں یہ عہد اور بیعت لیتا ہوں کہ میرے ساتھ حفاظت اور خیال کا وہی معاملہ کروگے، جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ کرتے ہو، انصار نے بیعت کی اور ـــــ آپؐ سے یہ وعدہ لیا کہ آپ ان کو چھوڑ کر پھر اپنی قوم میں واپس نہ جائیں گے۔ وہ زیرک و دانا تھے اور اس عہد و پیمان کے دور رس اور خطرناک نتائج سے بخوبی واقف تھے، وہ سمجھتے تھے کہ وہ تمام قریبی قبائل، بلکہ پورے عرب سے دشمنی مول لے رہے ہیں، ان کے ایک جہاندیدہ تجربہ کار رفیق (عباسؓ بن عبادہ انصاریؓ) بھی ان کو مزید نتائج سے آگاہ کیا، اور ہوشیار کیا، لیکن انھوں نے جواب میں بیک زبان ہو کر کہا کہ ہم مال و منال کے نقصان اور اپنے سربرآوردہ خاندان کے قتل و ہلاک ہو جانے کا

خطرہ مول لیتے ہوئے آپؐ کو لے جارہے ہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ملتفت ہوکر انھوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر ہم نے وعدہ وفا کر دکھلایا تو ہمیں کیا ملے گا؟

ایسے نازک موقع پر اگر خدا کے پیغمبروں جگہ کوئی سیاسی لیڈر، کوئی قومی رہنما، یا محض سیاسی سوجھ بوجھ کا کوئی انسان ہوتا تو اس کا جواب یہ ہوتا کہ افتراق وانتشار کے بعد اب تمہاری شیرازہ بندی ہوگی ایک قبیلہ کی معمولی حیثیت کے بعد اب پورے عرب میں تمہارا وجود تسلیم کیا جائے گا، اور تم ایک طاقت بن کر ابھروگے، یہ کوئی خیالی اور ناقابلِ قیاس بات نہ تھی، بلکہ تمام علامات وقرائن، اس کے امکان اور امر واقعہ بننے پر دلالت کرتے تھے، خود ان اہل یثرب میں سے ایک کہنے والے نے اس سے پیشتر کہا تھا کہ:

"ہم اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ شاید ہی کسی قوم میں ایسی دشمنی وانتشار ہو۔ جیسا ہماری قوم میں ہے ہمیں امید ہے کہ خدائے تعالیٰ آپؐ کے ذریعہ ان کی شیرازہ بندی کرے اب ہم ان کے پاس جائیں گے، اور آپؐ کی یہ دعوت ان کے سامنے پیش کریں گے، اور جس دین کو ہم نے قبول کیا ہے، ان کو بھی اس کی دعوت دیں گے، اگر خدائے تعالیٰ آپ کی ذات پر ان کو مجتمع فرمادے تو آپ سے بڑھ کر کوئی صاحب اقتدار اور باعزت وشوکت شخص نہ ہوگا"[1]

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس سوال کے جواب میں کہ "اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پھر ہمیں کیا ملے گا؟" صرف اس

[1] سیرۃ ابن ہشام، ج ۱ ص ۴۲۹

پر اکتفا فرمایا کہ "جنت" اس وقت انہوں نے عرض کیا کہ حضور دستِ مبارک دراز فرمایئے۔ آپؐ نے اپنا دستِ مبارک بڑھایا، اور انہوں نے بیعت کر لی[1]۔

اسی غیرت اور کارِ نبوت کی تکمیل کا اثر ہے کہ پیغمبر کسی شرعی حکم میں کسی تبدیلی کے نہ روادار ہوتے ہیں اور نہ کسی حکم پر عمل، کسی کی سفارش اور اثر سے موقوف و ملتوی رکھتے ہیں، وہ قریب و بعید یگانہ و بیگانہ سب پر یکساں طریقہ پر اللہ تعالیٰ کے حدود احکام کا نفاذ کرتے ہیں، چنانچہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک خاتون کے بارے میں، جس سے چوری کا جرم سرزد ہوا تھا، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ (جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص شفقت و عنایت تھی) سفارش کرنے کے لئے حاضر ہوتے تھے آپؐ نے غضب ناک ہوکر فرمایا "کہ اللہ کے متعین کردہ حدود کے بارے میں سفارش کرتے ہو"؟ پھر آپؐ نے تقریر فرمائی، جس میں فرمایا: "اے لوگو! تم سے پہلے امتیں اس لئے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کوئی، باوجاہت شخص اور خاندانی آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے، اور کوئی کمزور اور معمولی آدمی چوری کرتا، تو اس پر حد نافذ کرتے، قسم ہے خدائے پاک کی، اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ کاٹنے سے دریغ نہ کروں گا"[2]

یہی وہ غیرت ہے، جو انبیاء کرامؑ کے اصحابؓ و نائبین میں منتقل ہوئی، انھوں نے بھی کامیابی و ناکامی اور سود و زیاں سے آنکھیں بند کر کے قرآنی تعلیمات شرعی احکام، اور اسلام کے اصول و ضوابط کی حفاظت

[2] صحیح مسلم، کتاب الحدود باب حد السرقہ ونصابہا۔

کی، تاریخ میں اس کی شاندار مثال فاروق اعظمؓ کا وہ واقعہ ہے جو جبلہ ابن ایہم غسانی کے ساتھ (جو شاہانِ آلِ جفنہ کے سلسلہ کی اہم کڑی تھا) پیش آیا۔ وہ قبیلہ عکّ وغسّان کے پانچ سو افراد کے ساتھ مدینہ منورہ آیا جب وہ مدینہ میں داخل ہوئے تو کوئی دوشیزہ اور پردہ نشین عورت ایسی نہ تھی، جو اس کو اور اس کے زرق برق لباس کو دیکھنے کے لئے نہ نکل آئی ہو، اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج کے لئے تشریف لے گئے، تو جبلہ بھی ساتھ گیا، وہ بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا کہ بنی فزارہ کے ایک شخص کا پاؤں اس کے لٹکے ہوئے تہبند کی کور پر پڑ گیا اور کھل گیا، جبلہ نے ہاتھ اٹھایا اور فزاری کی ناک پر زور کا تھپڑ مارا، فزاری نے حضرت عمرؓ کے یہاں نالش کی، امیر المؤمنین نے جبلہ کو بلا بھیجا، وہ جب آیا تو، اس سے پوچھا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ اس نے کہا، ہاں امیر المؤمنین، اس نے میرا تہبند کھولنا چاہا تھا، اگر کعبہ کا احترام مانع نہ ہوتا تو میں اس کی پیشانی پر تلوار کا وار کرتا، حضرت عمر نے فرمایا کہ تم نے اقرار کر لیا اب یا تو تم اس شخص کو راضی کر لو، ورنہ میں قصاص لوں گا، جبلہ نے کہا کہ آپ میرے ساتھ کیا کریں گے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس سے کہوں گا کہ تمہاری ناک پر ویسے ہی ضرب لگائے، جیسی تم نے اس کی ناک پر لگائی۔ جبلہ نے حیرت و تعجب سے کہا کہ امیر المؤمنین! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ایک عام آدمی ہے، اور میں اپنے علاقہ اور قوم کا تاجدار ہوں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام نے تم کو اور اس کو برابر کر دیا، اب سوائے

تقویٰ اور عافیت کے کسی اور چیز کی بنیاد پر تم اس سے افضل نہیں ہو سکتے جبلہ نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ میں اسلام قبول کر کے جاہلیت کے مقابلہ میں زیادہ باعزت و باعتبار ہو جاؤں گا، حضرت عمرؓ نے فرمایا، یہ باتیں چھوڑ دو یا تو اس شخص کو راضی کرو، ورنہ قصاص کے لئے تیار ہو جاؤ۔

جبلہ نے جب حضرت عمرؓ کے یہ تیور دیکھے تو یہ عرض کیا کہ مجھے آج رات غور کرنے کا موقع دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے اس کی درخواست منظور کی، رات کے سناٹے اور لوگوں کی لاعلمی میں جبلہ اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو لیکر شام کی طرف روانہ ہو گیا۔ صبح مکہ میں اس کا پتہ نشان نہ تھا، ایک زمانہ کے بعد جب جثامہ بن مساحق کنانی سے جو اس کے دربار میں شریک ہوئے تھے حضرت عمرؓ نے اس کے شاہانہ کروفر کے حالات سنے تو صرف یہ فرمایا کہ وہ محروم رہا، آخرت کے بدلہ میں دنیا خریدلی، اس کی تجارت کھوٹی رہی [۱]

اس کا مطلب یہ نہیں کہ انبیائے کرام دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں حکمت سے کام نہیں لیتے، اور لوگوں کے فہم و فراست اور ادراک کے مطابق بات نہیں کرتے، حاشا و کلاّ یہ تو قرآنی نصوص، اور سیرتِ طیبہ کے بیسیوں واقعات کے منافی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهِۦ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ

(سورۃ ابراھیم۔ ۴)

(ترجمہ) "اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر وہ اپنی قوم کی زبان بولتا تھا، تاکہ انہیں (احکام خدا) کھول کھول کر بتادے"

[۱] فتوح البلدان بلاذری باختصار ص۱۴۲ و تاریخ ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۲۸۱۔

(ترجمہ) اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر وہ اپنی قوم کی زبان بولتا تھا، تاکہ انھیں (احکامِ خدا) کھول کھول کر بتا دے۔"

زبان کا مفہوم یہاں چند جملوں اور الفاظ میں محفوظ محدود نہیں، وہ اسلوب، طرزِ بیان، طرزِ کلام اور طریقِ تفہیم سب پر حاوی ہے، اس کا دلکش نمونہ حضرت یوسفؑ کی جیل میں اپنے دونوں ساتھیوں سے پند و موعظت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے اپنی اپنی قوم اور اپنے اپنے دور کے بادشاہوں سے مکالمے میں نظر آتا ہے [1] اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبیؐ اور آپؐ کے توسط سے قرآن کے ہر قاری اور اسلام کے ہر داعی و مبلغ کو یہ ہدایت فرمائی ہے:

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ. (سورۃ النحل-۱۲۵)

(ترجمہ) اے پیغمبر! لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ، اور بہت اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرامؓ کو جب دعوت و تبلیغ کی مہم پر روانہ فرماتے تو نرمی، شفقت سہولت و آسانی پیدا کرنے اور بشارت دینے کی وصیت فرماتے۔

---

[1] اس موعظت و مکالمے کے نفسیاتی اور بیانی و ادبی تجزیہ کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب دعوت و عزیمت کا معجزہ اسلوب" شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام لکھنؤ"

آپؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن بھیجتے ہوئے وصیت فرمائی:

يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا، بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا

(ترجمہ) آسانی پیدا کرنا، سختی نہ کرنا، خوشخبری دینا متوحش نہ بنانا"

اور خود اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران ۱۵۹)

(ترجمہ) "اے محمدؐ خدا کی مہربانی سے تمہاری افتاد مزاج ان لوگوں کے لئے نرم واقع ہوئی ہے، اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ سے بالعموم فرمایا:

اِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ[1]

(ترجمہ) تمہیں آسانی پیدا کرنے کے لئے اٹھایا گیا ہے، دشواری پیدا کرنے کے لئے نہیں اٹھایا گیا ہے۔)

اس سلسلہ کے نصوص و دلائل بے شمار ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے[2]

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۳۵ اور ص ۳ [2] اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ کے باب التیسیر کا مطالعہ کیا جائے۔

انبیائے سابقین کی بھی یہی امتیازی شان رہی ہے۔ متعدد انبیاء کے ناموں کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے آخر میں فرمایا گیا :

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۔ (الانعام ۔ ۸۹)

(ترجمہ) یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم کتاب اور فیصلہ کن رائے قائم کرنے کی صلاحیت اور نبوت عطا فرمائی تھی ۔

لیکن اس آسانی تدریج اور تیسیر کا تعلق تعلیم و تربیت اور جزوی مسائل سے تھا، جن کا عقائد اور دین کے بنیادی اصول سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جن باتوں کا تعلق عقائد اور حدود اللہ سے ہے ان میں ہر دور کے انبیائے کرام فولاد سے زیادہ اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط ہوتے تھے ۔

(۴) نبوت کی امتیازی خصوصیات اور انبیائے کرام کے دعوت کے خط و خال میں ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ ان کا اصل زور آخرت کی زندگی اور اس کی کامیابی اور سعادتوں کے حصول پر ہوتا ہے، وہ اس کا اس کثرت سے تذکرہ کرتے ہیں اور اس کا اس درجہ اہتمام و فکر کہ وہ ان کی دعوت کا مرکزی نقطہ اور محور بن جاتی ہے، صاف ذہن کے ساتھ ان کے واقعات اور اقوال کا مطالعہ کرنے والا صاف محسوس کرتا ہے کہ آخرت ان کا نصب العین ہے، اور ان کے لئے ایک مرئی اور بدیہی حقیقت ہے، یہ بات ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے، اور اس کا یقین ان کے احساسات اور فکر و دماغ پر چھایا ہوا نظر آتا ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن و مطیع بندوں کے لئے آخرت میں جو نعمتیں مقدر کر رکھی ہیں اور کافروں اور نافرمانوں کے لئے وہاں جو عذاب مقدر فرمایا ہے، اس کا ہمہ وقت خیال ہی وہ حقیقی محرک ہے، جو ان کو عقیدہ کی تصحیح، زندگی کی اصلاح اور رشتۂ عبودیت کی استواری کی دعوت پر ابھارتا ہے، وہ ان کو بے چین رکھتا ہے اور ان کی راتوں کی نیند اور دن کا اطمینان اس طرح اڑا دیتا ہے کہ ان کو کسی پہلو قرار نہیں آتا۔

سیرت کا ہر ذہین مطالعہ کرنے والا یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ انبیاء کی ایمان بالآخرت کی دعوت اور اس کی اہمیت کی تبلیغ و تشہیر صرف اخلاقی یا اصلاحی ضرورت کے تحت نہیں تھی، جس کے بغیر کوئی صالح معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا، نہ پاکیزہ تمدن کی بنیاد پڑ سکتی ہے یہ خیال اپنی جگہ پر صحیح ہے، اور ایک تاریخی واقعہ جس کی پوری انسانی تاریخ شہادت دیتی ہے، لیکن انبیاء کا طریق کار اور ان کی سیرت، اسی طرح ان کے نائبین کا طریق کار اس سے مختلف ہے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ انبیاء کے طریقِ دعوت و تبلیغ میں یہ ایمان، وجدانی کیفیت اور قلبی جذبہ اور دردمندی کے ساتھ اور دوسرے طریقہ میں وہ ضابطہ اور ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اخلاقی و معاشرتی ضرورت کی حد تک ہی اس کی تلقین کی جاتی ہے اور دونوں میں جو فرق ہے وہ کسی دلیل کا محتاج نہیں۔

(۵) پانچواں امر یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدائے تعالیٰ ہی حاکمِ حقیقی اور فرمانروائے مطلق ہے اور شریعت سازی صرف اسی کا حق ہے، اس کا ارشاد ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (سورۂ یوسف ۴۰)

(ترجمہ) خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (سورہ شوریٰ ۲۱)

(ترجمہ) کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کا خدا نے حکم نہیں دیا۔

لیکن درحقیقت خالق و مخلوق اور عبد و معبود کا تعلق، حاکم و محکوم آمر و مأمور، اور ایک بادشاہ اور رعیّت کے تعلق سے کہیں زیادہ وسیع، کہیں زیادہ عمیق، کہیں زیادہ لطیف اور کہیں زیادہ نازک ہے قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کو جس تفصیل کے ساتھ اور جتنے دلاویز طریقہ پر بیان کیا ہے[1] اس کا مقصد قطعاً یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بندہ سے صرف اتنا مطلوب ہے کہ وہ اس کو اپنا حاکم اعلیٰ اور آمرِ مطلق سمجھ لے، اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ میں کسی کو شریک نہ کرے، بلکہ ان اسماء

---

[1] بطور مثال سورہ حشر کی آخری آیات هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سے وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ تک پڑھئے

وصفات اور ان افعالِ الٰہی کے ذکر کا جن سے قرآن شریف بھرا ہوا ہے اور ان آیات کا جن میں خدائے تعالیٰ سے محبت[1] و تعلق اور بکثرت، ہمیشہ اس کے ذکر کی ترغیب آئی ہے، صاف تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دل و جان سے محبت کی جائے اور اس کی طلب و رضا میں جان کھپا دی جائے اس کی حمد و ثنا کے گیت گائے جائیں، اٹھتے بیٹھتے اس کے نام کا وظیفہ پڑھا جائے، اسی کی دُھن ہر وقت دل و دماغ میں سمائی رہے، اسی کے خوف سے انسان ہر وقت لرزاں اور ترساں رہے، اسی کے سامنے دستِ طلب ہر وقت پھیلا رہے، اسی کے جمالِ جہاں آرا پر ہر وقت نگاہیں جمی رہیں، اسی کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے حتیٰ کہ سر کٹا دینے کا جذبہ بیدار رہے۔

(۶) دین کے مزاج اور اس کی نمایاں خصوصیات کی اس بحث کے سلسلے میں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن کے سرگروہ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، ان کا مخلوق سے اور قوموں سے جن کی طرف وہ بھیجے جاتے ہیں، چھٹی رساں (پوسٹمین) اور ڈاکیہ جیسا تعلق نہیں ہوتا، جس کی

---

[1] مثلاً: وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ اور وہ آیات ملاحظہ ہوں جن میں ذکر اللہ کی ترغیب و تاکید ہے اور انبیاء علیہم السلام کی محبتِ الٰہی، شوق اور تڑپ اور عزیز ترین چیزوں کی قربانی کا ذکر ہے۔

ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ خطوط اور ڈاک مرسل الیہم تک پہنچا دے
پھر اسے ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں اور ان لوگوں کو اس درمیانی
واسطہ اور قاصد سے کوئی مطلب نہیں، وہ اپنے کاموں اور اختیارات
میں بالکل آزاد ہیں اور ان کی انفرادی و عائلی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں
یہ وہ غلط، بے بنیاد اور ادھورا تصور ہے، جو ان حلقوں میں رائج تھا، جو
نبوت اور انبیاء کے بلند مقام سے ناواقف تھے اور ہمارے اس دور میں ان
حلقوں میں پھیلا ہوا ہے۔ جو مقام سنت سے ناواقف اور حدیث اور اس
کی حجیت کے منکر ہیں۔ اور جن پر مذہب کے مسیحی تصورات کا اثر اور مغربی طرزِ
فکر کا غلبہ ہے۔

اس کے برخلاف حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کرام پوری انسانیت
کے لئے اسوۂ کامل، اعلیٰ قابلِ تقلید نمونہ اور اخلاق، ذوق و رجحان
ردّ و قبول اور وصل و فصل کے بارے میں سب سے مکمل اور آخری معیار
ہوتے ہیں، وہ مورد عنایاتِ الٰہی اور مرکزِ الطاف و تجلیات ہوتے ہیں، ان کے
اخلاق و عادات اور ان کی زندگی کا طور و طریق سب خدا کی نظر میں محبوب ہیں
زندگی کے طریقوں میں ان کا طریقِ حیات انسانوں اور جماعتوں کے اخلاق میں ان
کے اخلاق اور لوگوں کی گوناگوں عادتوں میں ان کی عادتیں اللہ کے نزدیک
پسندیدہ بن جاتی ہیں، انبیاء جس راستہ کو اختیار کرتے ہیں وہ راستہ خدا
کے یہاں محبوب بن جاتا ہے اور اس کو دوسرے راستوں پر ترجیح حاصل ہوتی
ہے، صرف اس وجہ سے کہ انبیاء کے قدم اس راستہ پر پڑے ہیں،

ان کی تمام پسندیدہ چیزوں اور شعائر اور ان سے نسبت رکھنے والی اشیاء اور اعمال سے اللہ کی محبت اور پسندیدگی متعلق ہو جاتی ہے، ان کا اختیار کرنا اور ان کے اخلاق کی جھلک پیدا کرنا، اللہ کی محبت اور رضا سے سرفراز ہونے کا قریب ترین اور سہل ترین راستہ ہو جاتا ہے، اس لئے کہ دوست کا دوست، دوست اور دشمن کا دوست دشمن سمجھا جاتا ہے، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے کہلایا گیا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝[1]

(ترجمہ) اے پیغمبر (لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس کے برعکس جو ظلم پر کمر باندھے ہوئے اور کفر کی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں ان کی طرف دل کا میلان، ان کے طریقِ حیات کی ترجیح اور ان سے صوری و معنوی مشابہت، اللہ کی غیرت کو حرکت میں لانے والی اور اللہ سے بندے کو دور کرنے والی بتائی گئی ہے، فرمایا گیا:

وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ (سورۃ ہود: ۱۱۳)

(ترجمہ) اور جو لوگ ظالم ہیں ان کی طرف مائل نہ ہونا، نہیں تو تمہیں دوزخ کی آگ آ لپٹے گی اور خدا کے سوا تمہارے اور دوست نہیں ہیں (اگر تم ظالموں

[1] آل عمران - ۳۱

کی طرف مائل ہو گئے) تو پھر تم کو (کہیں سے) مدد نہ مل سکے گی۔

ان پیغمبرانہ مخصوص عادات و اطوار کا نام شریعت کی زبان اور اصطلاح میں "خصال فطرت" اور "سنن الہدیٰ" ہے جس کی شریعت تعلیم و ترغیب دیتی ہے، ان اخلاق و عادات کا اختیار کرنا لوگوں کو انبیاء کے رنگ میں رنگ دیتا ہے، اور یہ وہ رنگ ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :-

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ٥ (سورۃ البقرہ : ۱۳۸)

(ترجمہ) (کہدو کہ ہم نے) خدا کا رنگ (اختیار کرلیا) اور خدا کے رنگ سے بہتر رنگ کس کا ہو سکتا ہے، اور ہم اس کی عبادت کرنے والے ہیں۔

ایک عادت کی دوسری عادت، ایک اخلاق کے دوسرے اخلاق، ایک طور طریق کے دوسرے طور طریق پر دین و شریعت میں ترجیح کا یہی راز ہے۔ اسی وجہ سے اس کو شریعت اسلامی اہل ایمان کا شعار، فطرت کے تقاضے کی تکمیل اور اس کے خلاف طریقوں کو فطرت سلیمہ سے، انحراف اور اہل جاہلیت کا شعار قرار دیتی ہے اور ان دونوں طریقوں اور راستوں میں (باوجود اس کے کہ اس طرف بھی عقل و خرد رکھنے والے متمدن انسان ہیں، اور اس طرف بھی) محض اس بات کا فرق ہے کہ ایک خدا کے پیغمبروں اور اس کے محبوب بندوں کا اختیار کیا ہوا ہے،

دوسرا ان لوگوں اور قوموں کا جن کے پاس ہدایت کی روشنی اور آسمانی تعلیمات نہیں ہیں، ان اصول کے تحت کھانے پینے، کاموں میں دائیں بائیں ہاتھ کا فرق، لباس وزینت، رہنے سہنے اور تمدن کے بہت سے اصول آجاتے ہیں۔ اور یہ سنت سنتِ نبوی اور فقہ اسلامی کا ایک وسیع باب ہے[1]۔

جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق ہے وہاں اس پہلو پر اور زیادہ زور دینے اور اس کا زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، آپ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ صرف ضابطہ اور قانون کا تعلق کافی نہیں، روحانی اور جذباتی تعلق اور ایسی گہری اور دائمی محبت مطلوب ہے جو جان و مال و اہل و عیال کی محبت پر فوقیت لے جائے صحیح حدیث میں آیا ہے:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔[2]

(ترجمہ) اس وقت تک تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوگا، جب تک میں اس کو اپنی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "منصبِ نبوت اور اس کے بلند مقام حاملین" صفحہ ۱۸-۲۰

[2] بخاری و مسلم

دوسری حدیث ہے :-

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ نَفْسِہٖ[1] -

(ترجمہ) تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہ ہوگا جب تک میں اسے اپنی ذات سے زیادہ عزیز و محبوب نہ ہوں -

اس سلسلہ میں ان تمام مخالف اسباب و محرکات سے محفوظ و محتاط رہنے کی ضرورت ہے جو اس محبت کے سوتوں کو خشک یا اس کو کمزور کرتے ہیں، جذبات و احساسات محبت میں افسردگی سنت پر عمل کرنے کے جذبہ میں کمزوری، اور آپؐ کو دانائے سبل، ختم الرسلؐ، مولائے کل سمجھنے میں تردد اور سیرت و حدیث کے مطالعہ سے روگردانی اور بے توجہی کا سبب بنتے ہیں۔ سورۂ احزاب، سورۂ حجرات اور سورۂ فتح وغیرہ قرآنی سورتوں کے غائر مطالعہ اور تشہد و نمازِ جنازہ میں درود و صلوٰۃ کی شمولیت پر غور و فکر، قرآن میں درود کی ترغیب اور درود کی فضیلت میں بکثرت وارد ہونے والی احادیث کا راز سمجھنے کا یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک مسلمان سے اس سے کچھ زیادہ مطلوب ہے جس کو صرف قانونی و ضابطہ کا تعلق کہا جاتا ہے اور جو محض ظاہری اطاعت سے پورا ہو جاتا ہے بلکہ وہ پاس و ادب، محبت اور تشکر و امتنان کا جذبہ بھی مطلوب ہے، جس کے سرچشمے دل کی گہرائیوں سے

[1] مسند احمد

پھوٹتے ہوں، اور جو رگ وریشہ میں سرایت کر گیا ہو، اسی پُر محبت احترام اور احترام آمیز محبت کو قرآن تعزیر وتوقیر کے لفظ سے ادا کیا ہے

وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (سورۂ فتح - ۹)

(ترجمہ) اس کی مدد کرو اور اس کو بزرگ سمجھو۔

اس کی تابندہ اور روشن مثالیں غزوۂ رجیع کے موقع پر حضرت خبیب ابن عدیؓ اور زید ابن الدثنہؓ کے واقعہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ابودجانہؓ اور حضرت طلحہؓ کے طرزِ عمل، غزوۂ اُحد میں بنی دینار کی مسلمان خاتون کے جواب، صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی والہانہ محبت اور ادب واحترام میں دیکھی جا سکتی ہے، جن کی بناء پر ابوسفیان (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ "میں نے کسی کو کسی سے اسطرح محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا، جس طرح محمدؐ کے ساتھی محمد سے محبت کرتے ہیں۔" اور قریش کے قاصد عروہ بن مسعود ثقفی نے کہا کہ "قسم بخدا میں نے کسریٰ اور قیصر کے دربار بھی دیکھے ہیں، میں نے کسی بادشاہ کی ایسی عزت ہوتے ہوئے نہیں دیکھی جس طرح ... کے ساتھی محمدؐ کی عزت کرتے ہیں۔"[1]

---

[1] پورے واقعات سیرت کی کتابوں میں ملاحظہ فرمائے جائیں۔ زید ابن الدثنہ کو جب قتل گاہ میں لے جایا جا رہا تھا تو ابوسفیان نے ان سے (باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس عشقِ رسول سے ان علمائے راسخین، مصلحین و مجدّدِ دین زعماء و قائدین کو بہرۂ وافر ملا، جنہوں نے دین کی حقیقی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور جن کے مقدّر میں دین و ملّت کے احیاء و تجدید کا اہم کارنامہ انجام دینا تھا۔ اس پاک محبت کے بغیر جو شرعی احکام و آداب کے تابع و اُسوۂ صحابہؓ کے اتّباع و تقلید کے ساتھ ہو اُسوۂ رسول کی کامل پیروی و اتّباع،

کہا کہ کیا تم پسند کرو گے کہ محمدؐ تمہاری جگہ پر ہوں اور تم اپنے گھر میں مامون و محفوظ ہو؟ حضرت زیدؓ نے کہا، خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی منظور نہیں کہ محمدؐ جہاں ہیں وہیں ان کے کوئی کانٹا بھی چبھے اور میں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا رہوں۔" (سیرت ابن ہشام ۲ ص۱۷۲) بنی دینار کی ایک مسلمان خاتون کے شوہر بھائی اور باپ غزوۂ اُحد میں کام آئے، جب ان کو اس حادثہ کی اطلاع دی گئی تو ان کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ یہ بتاؤ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ الحمد للہ آپ خیریت سے ہیں، انھوں نے کہا کہ مجھے دیدار کرا دو، جب ان کی نظر چہرۂ مبارک پر پڑی تو بول اٹھیں "آپؐ کے ہوتے ہوئے ہر مصیبت ہیچ ہے۔" (ابن ھشام)

ابو دجانہؓ نے اپنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ڈھال بنا دیا۔ (بخاری) اور حضرت ابو طلحہؓ نے اپنے ہاتھ کو سپر بنا دیا، یہاں تک کہ وہ حرکت و استعمال کے قابل نہیں رہا۔ (الاصابہ)

جادۂ شریعت پر استواری، نفس کا دیانت دارانہ محاسبہ اور عسر و یسر اور طبیعت کی آمادگی و گرانی (منشط و مکرہ) میں خدا اور رسول کی فرمانبرداری ممکن نہیں یہی (کثیر النوع) نفسیاتی امراض کا علاج تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق کا مؤثر ذریعہ ہے، محبت کی ایک لہر خس و خاشاک کو بہالے جاتی ہے اور رگ و ریشہ اور جسم و جاں میں اس طرح دوڑ جاتی ہے اور جذب ہو جاتی ہے، ع شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم۔

مسلمان جو کبھی خدا اور رسول کے عشق کی بدولت شعلۂ جوّالہ تھے، اس کے بغیر چوب خشک اور سرد خاکستر ہوئے ہیں ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے   مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

(۷) اس دین کی ایک خصوصیت اس کی کاملیت اور دوام ہے، کیونکہ یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ عقائد و شریعت اور دنیا میں جن چیزوں پر سعادت اور آخرت میں نجات کا دار و مدار ہے ان کی مکمل تعلیم دی جا چکی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝ (سورۃ الاحزاب - ۴۰)

(ترجمہ) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، بلکہ خدا کے پیغمبر اور خاتم النبیین ہیں، خدا ہر چیز سے واقف ہے۔

اور قرآن نے عربی مبین میں صاف صاف کہدیا کہ یہ دین اپنے کمال، انسانی ضرورتوں اور تقاضوں کی ایک تکمیل اور بقائے دوام کی صلاحیت کی آخری منزل پر پہنچ چکا اور فرمادیا گیا

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۝ (سورۃ المائدہ - ۳)

(ترجمہ) آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

یہ آیت عرفات کے دن حجۃ الوداع کے موقع پر ۱۰ھ میں نازل ہوئی۔ بعض ذہین یہودی علماء، جو قدیم مذاہب کی تاریخ سے واقف تھے بھانپ گئے کہ یہ وہ اعزاز ہے جو تنہا مسلمانوں کو بخشا گیا ہے اور یہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے، جس میں کوئی مذہب و ملّت شریک نہیں، انہوں نے امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضؓ سے کہا کہ اے امیر المومنین آپ اپنی کتاب میں ایک ایسی آیت کی تلاوت کرتے ہیں جو اگر ہم یہودیوں پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس روز عید مناتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوّت کا انقطاع و اختتام، انسانیت کا اعزاز اور اس کے ساتھ رحمت و شفقت کا نتیجہ تھا، اور اس کا اعلان تھا کہ اب انسانیت سنِ بلوغ اور پختگی و کمال کے مرحلہ کو پہنچ گئی اور اپنے اس تنگ دائرہ سے نکل چکی ہے، جس میں وہ صدیوں تک رہی تھی۔ اب وہ علم و تمدّن، باہمی تعارف، عالمی وحدت اور تسخیرِ کائنات کے مرحلہ میں داخل ہو رہی ہے اور اس کی امید پیدا ہو گئی ہے کہ وہ طبیعاتی رکاوٹوں، جغرافی تقسیم اور علیحدگی پسندی کے رجحانات پر قابو حاصل کر لے گی۔ قوم و وطن کے بجائے اب وہ کائنات، وسیع انسانیت، عالمگیری ہدایت اور مشترک علم و فن کے مفہوم سے آشنا ہو رہی تھی، اور زندگی کے میدان میں طبعی قوتوں، قدرتی وسائل، عقل مومن و قلب سلیم اور مشترک جدّ و جہد سے کام لینے کے لیے متیار ہو رہی تھی

زمانۂ قدیم میں اس حقیقت کے گنجلک ہونے، حق و باطل کی آمیزش اور کثرت سے ایسی دعوتوں کے وقتاً فوقتاً ظہور کی وجہ سے جو آسمان کے ساتھ تعلق خاص اور آسمانی تعلیمات کے براہِ راست حاصل کرنے کے غلط طریقہ پر مدّعی تھیں لوگوں کو ایمان لانے کی دعوت دیتیں اور اسی بنیاد پر ان کو مومن و کافر کے طبقوں میں بانٹتی

تھیں، سابقہ امّتوں اور قوموں کو بڑے مصائب اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، یہودی اور مسیحی دنیا میں ایسے مدعیانِ نبوت کا پیدا ہونا ایک فیشن بن گیا، اور وہ وقت کا ایک اہم مسئلہ بن گئے، جس نے ذہنی اور دینی توانائیوں کو کوئی اور مفید کام کرنے کے بجائے اس مسئلہ کے حل کرنے میں مشغول کر لیا۔ یہودی اور مسیحی معاشرے میں انتشار، افتراق اور نفسیاتی و عقلی کشمکش پیدا کر دی۔

سلسلۂ نبوت کا خاتمہ سے انسانی صلاحیتیں اور قوتیں اس خطرہ سے محفوظ ہو گئیں کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ اور تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلہ پر ایک نئے نبی یا دعوت کا ظہور ہو اور دینی معاشرہ سارے مسائل سے صرف نظر کر کے اس کی حقیقت معلوم کرنے اور اس کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کرنے میں لگ جائے اس طرح محدود انسانی قوت کو اس روز روز کی مشغولیت اور آزمائش سے بچا لیا گیا اور بجائے اس کے کہ نسلِ انسانی (نئی وحی و ہدایات کے لئے) بار بار آسمان کی طرف نگاہ اٹھائے اور نئی اور مستقل رہنمائی کی طالب و منتظر رہے اس کو اپنی خداداد صلاحیتوں اور طاقتوں کے استعمال کے لئے کائنات اور اس زمین پر توجہ کرنے کی دعوت دی گئی اور اس طرح فکری انتشار، ذہنی کشمکش اور وحدت اجتماعی کے پارہ پارہ ہونے سے وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔

اس عقیدہ ہی کی بنیاد پر یہ امت خطرناک سازشوں کا مقابلہ کر سکی اور دین و عقائد کی وحدت ایک روحانی مرکز، ایک عالمی ثقافت اور علمی سرچشمہ اور ایک قطعی تشخص ہے۔ جس سے اس کا گہرا اور قوی ربط ہے۔ اس کی بنیاد پر سارے عالم میں مسلمانوں میں اجتماعیت اور اتحاد قائم ہو سکتا ہے، اس سے ذمہ داری کا قوی احساس ابھرتا ہے اور معاشرہ میں اس سے فساد کے ازالہ، حق و انصاف کے قیام، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دینِ خالص کی دعوت کا کام لیا جا سکتا ہے

امّت کو اب نہ کسی نئے نبی کی بعثت کی ضرورت ہے اور نہ کسی ایسے امام معصوم کے ظہور کی جو انبیائے کرام کے کام کو (جسے خاکم بدہن وہ مکمل نہ کرسکے) کی تکمیل کرے اور نہ اسلامی نشأۃ ثانیہ اور جدید دینی تحریک کے لئے کسی پُراسرار دعوت یا شخصیت پر اعتماد کی ضرورت ہے جو عقل کے احاطہ میں نہ آئے۔ اور حقائق ظاہری سے بالاتر ہو اور جس سے مفاد پرست، طالع آزما اور سیاسی اغراض کی تکمیل کے خواہش مند فائدہ اٹھالیں۔ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ٥

(۸) اس دین کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی اصل حقیقت، زندگی اور تر و تازگی کے ساتھ باقی ہے، اس کی کتاب محفوظ اور ہر دور میں قابلِ فہم ہے اس کی حامل امّت عام گمراہی اور جہالت اور اس اجتماعی انحراف، فریب خوردگی اور کسی سازش کا شکار ہو جانے سے محفوظ ہے جس میں بہت سے مذاہب اور ملتیں اپنے تاریخ کے کسی دور میں اور پیروانِ مسیحیت بالکل ابتدا ہی میں مبتلا ہو گئے تھے قرآن کا یہ اعجاز اور منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے کہ اس نے قرآن مجید کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی سورۃ (فاتحہ) میں عیسائیوں کو وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے لقب سے ممیز و مشخص کیا اس لفظ اور وصف کے (جو یہودیوں کے وصف الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مختلف ہے) کی تخصیص کا راز وہی سمجھ سکتا ہے جو مسیحیت کی تاریخ اور اس کے نشو و ارتقاء کے مراحل سے بخوبی واقف ہے۔ مسیحیت بالکل ابتدائی مرحلہ میں (جس کو طفولیت کہنا بجا ہوگا) اس جادۂ حق سے ہٹ گئی، جس پر حضرت مسیح علیہ السلام اس کو چھوڑ کر گئے تھے۔ اور بالکل ایک دوسری سمت کی طرف اس کا قافلہ رواں دواں ہو گیا۔ اس سلسلہ میں صرف ایک شہادت کافی ہے۔ ایک مسیحی فاضل

ERNEST DE BUNSEN اپنی کتاب ISLAM OR TRUE CHRISTIANITY میں لکھتا ہے :

"جس عقیدہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے، اس کی دعوت حضرت مسیحؑ نے اپنے قول وعمل سے کبھی نہیں دی تھی، اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں و مسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے، اس کی ذمہ داری حضرت مسیحؑ کے سر نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب اس یہودی، عیسائی نے دین پال کا کرشمہ ہے، نیز صُحُفِ مقدسہ کی تمثیل و تجسیم کے طریقہ پر تشریح اور ان صحیفوں کو پیش گوئیوں اور مثالوں سے بھر دینے کا نتیجہ ہے۔ پال نے اسٹیفن (STEPHEN) کی تقلید میں جو مذہب ایسانی (ESSENIS) کا داعی ہے، حضرت مسیحؑ کے ساتھ بہت سی بودھ رسوم وابستہ کر دیں، آج انجیل میں جو متضاد کہانیاں اور واقعات ملتے ہیں اور جو حضرت مسیحؑ کو ان کے مرتبہ سے فروتر شکل میں پیش کرتے ہیں، وہ سب پال کے وضع کئے ہوئے ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے نہیں، بلکہ پال اور ان کے بعد آنیوالے پادریوں اور راہبوں نے اس سارے عقیدہ و نظام کو مرتب کیا ہے جس کو آرتھوڈکس مسیحی دنیا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدہ کی اساس قرار دے رکھا ہے۔"[۱]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

(ترجمہ) بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہمیں نے اُتاری ہے اور ہمیں اس کے نگہبان ہیں۔

فضل و احسان جتانے کے ایسے خصوصی موقع پر اور حفاظت کے وعدہ کے ایسے صریح اعلان میں اس کے مطالب کا فہم، ان کی تشریح، اس کی تعلیمات پر عمل اور زندگی میں

---

[۱] ISLAM OR TRUE CHRISTIANITY P. 12

ان کا انطباق بھی قدرۃً شامل ہو جاتا ہے۔ اور ایسی کتاب کی کیا قدر و قیمت اور منزلت ہو سکتی ہے، جو مدت تک فہم کے لحاظ سے چیستان اور عمل کے لحاظ سے معطل اور متروک رہے؟ خود عربی زبان کا بلیغ لفظ "حفظ" جس کا اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں وعدہ کیا گیا ہے، بڑے وسیع آفاق اور عمیق معانی رکھتا ہے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ فرمایا گیا:-

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۗ (سورۃ القیمۃ ۱۷-۱۸-۱۹)

(ترجمہ) اس (قرآن) کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے، جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم (اس کو سنا کرو) پھر اسی طرح پڑھو پھر (اس کے معنی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

پھر وہ دین یوں بھی قابل اعتماد نہیں جس پر صرف چند مختصر وقتوں میں (جن کے درمیان ایسے وسیع اور گہرے خلا رہے ہیں، جن میں تاریکی اور ظلمت چھائی رہی) عمل کیا گیا۔ وہ درخت جو ایک طویل اور بہتر سے بہتر موسم پانے کے باوجود پھل نہ دے قابلِ اعتنا و اعتماد نہیں ہو سکتا اور اس پر تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا [1] کی قرآنی مثال صادق نہیں آسکتی۔ پھر یہ اُمت، صرف اُمّتِ دعوت اور اس کتاب آسمانی و پیغامِ الٰہی کے مخاطب ہی نہیں، وہ اس دین و پیغام کی حامل، اس کو دنیا پھیلانے اس کی تفہیم و تشریح کرنے، اس پر عمل کی دعوت دینے اور خود اس کا نمونہ بننے کی بھی ذمہ دار ہے۔ اس لئے اس کا فہم کتاب ایسی ایک قوم کی فہم سے زیادہ

[1] وہ درخت ہر زمانے میں اپنے رب کی اجازت سے پھل دیتا ہے۔ (سورہ ابراہیم ۲۵)

ہونا چاہئے جس کی صرف خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زبان میں یہ کتاب اُتری ہے ۔

۹ آخری بات یہ ہے کہ اسلام کو ایک معاون فضا بلکہ زیادہ واضح اور محتاط الفاظ میں ایک مناسب موسم اور متعین درجۂ حرارت و برودت (TEMPERATUR) کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ ایک زندہ انسانی دین ہے۔ وہ کوئی عقلی و نظریاتی فلسفہ نہیں جو صرف دماغ کے کسی خانہ یا کتب خانہ کے کسی گوشہ میں موجود و محفوظ ہے ۔ وہ بیک وقت عقیدہ و عمل، سیرت و اخلاق، جذبات و احساسات اور ذوق کے مجموعہ کا نام ہے۔ وہ انسان کو نئے سانچہ میں ڈالتا اور زندگی کو نئے رنگ میں رنگتا ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسلام کو صبغۃ اللہ کی صفت سے یاد فرماتا ہے۔ صبغتہ ایک رنگ، امتیازی نشان اور چھاپ ہے۔ اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں زیادہ حسّاس (SENSITIVE) واقع ہوا ہے، اس کے متعین و معروف حدود ہیں جن سے کوئی مسلمان تجاوز نہیں کر سکتا۔ کسی دوسرے مذہب میں ارتداد کا نہ وہ واضح مفہوم پایا جاتا ہے، نہ اس کی وہ شناعت و قباحت ہے جو اسلامی شریعت اور اسلامی تصوّر میں پائی جاتی ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور ارشادات و ہدایات، آپ کا اُسوۂ مبارکہ و سنّت (عقائد و عبادات سے لے کر اخلاق و معاملات اور احساسات و جذبات تک) دین کے لئے وہ فضا اور ماحول مہیّا کرتے

کرتے ہیں، جس میں دین کا پودا سرسبز اور بار آور ہوتا ہے۔ کیونکہ دین زندگی کے تمام شرائط وصفات (نمو و حرکت، اہتزاز و فرحت، نفرت و کراہیت، احساسِ برتری و فخر) کا مجموعہ ہے، اس لئے وہ پیغمبر کے جذبات و احساسات اور اس کی زندگی کے واقعات اور عملی مثالوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اس کا بہترین مجموعہ احادیثِ صحیحہ اور محفوظ و مدوّن سنّتِ نبوی ہے۔ دین ایک مثالی اور معیاری ماحول کی نظیر کے بغیر زندہ و شاداب نہیں رہ سکتا، اور یہ ماحول حدیثِ نبوی کے ذریعہ محفوظ ہے، اس لیے اللہ تعالےٰ نے قرآن حکیم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ حاملِ قرآن کے صحیفۂ حیات کی بھی حفاظت فرمائی۔ اسی کی بدولت حیاتِ طیّبہ کی فیض رسانی اور حیات بخشی کا امتداد و تسلسل اس وقت تک باقی ہے۔ اسی کے نتیجہ میں علمائے اُمّت معروف و منکر، سنّت و بدعت اور اسلام و جاہلیت میں ہر دَور میں فرق کرنے کے قابل ہوتے اور ان کے پاس بیرومیٹر (BAROMETER) (ہوا کا دباؤ ناپنے کا آلہ) رہا، جس سے وہ اپنے دَور کے مسلمان معاشرہ کے اصل اسلامی عقیدہ و عمل سے بُعد و انحراف کی پیمائش کرتے رہے، وہ امّت کے دینی محاسبہ کا عمل جاری اور اصل دین کی دعوت کے فریضہ کو ہر دَور میں قائم اور باقی رکھ سکے، سنت و حدیث کے یہ مجموعے (جن میں صحاح ستّہ[1] ممتاز و معروف ہیں) اور ان کے

---

[1] یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سُنن ابوداؤد، جامع ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، امام مالک رحمہ کی مؤطا بھی اسی درجہ کی کتابوں میں ہے

درس وتدریس، نشر واشاعت کی مشغولیت اور مواقع ہمیشہ اصلاح
وتجدید اور امتِ اسلامیہ میں صحیح اسلامی فکر کا سرچشمہ رہے ہیں
انھیں کی مدد سے اصلاح کا بیڑہ اٹھانے والوں نے تاریخ کے مختلف
دَوروں میں شرک وبدعت اور رسومِ جاہلیت کے تردید ومخالفت
اور سنّت کی اشاعت وترویج کا جھنڈا بلند کیا۔ اسی ذخیرہ نے
علمائے دین اور اہلِ شعور کو شر وفساد اور بدعات وضلالت کی
طاقتوں اور تحریکوں سے پنجہ آزمائی کرنے اور ان کے مقابلہ میں
کفن بر دوش ہو کر صف آرا ہو جانے پر آمادہ کیا۔ اور تاریخ کی شہادت
ہے کہ اس میں اصلاح وتجدید کی تاریخ علم وحدیث سے واقفیت واشتغال
اور سنّت کی محبّت وحمایت سے وابستہ ومربوط ہے۔ جب بھی
حدیث وسنّت کی کتابوں سے علمی حلقوں کے تعلق وواقفیت میں کمی
آئی اور دوسرے علوم وفنون میں ان کا انہماک بڑھا، مسلم معاشرہ،
اہلِ صلاح واہلِ کمال کی موجودگی میں نئی نئی بدعات، جاہلی وعجمی رسم و
رواج، غیر مسلموں کے اختلاط اور مذاہبِ غیر کے اثرات کا شکار ہو گیا ہے
اور کبھی کبھی یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا کہ وہ جاہلی معاشرہ کا دوسرا
ایڈیشن اور اس کی مکمّل عکس نہ بن جائے۔[1]

[1] اس اجمال کی تفصیل اور اس دعوٰی کے تاریخی شواہد ودلائل کے لئے ملاحظہ
ہو مصنّف کا رسالہ "اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا
بنیادی کردار" شائع کردہ مجلس نشریاتِ اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ

یہ ہے دین کا وہ مزاج اور اس کے امتیازی صفات اور نمایاں خط و خال جن سے دین کی اس شخصیت کی نمو اور بقاء ہے جو اس کو دوسرے مذاہب اور فلسفوں سے ممتاز کرتی ہے، ایک مسلمان کو اس سے واقف بھی ہونا چاہئے اور اس کے بارے میں اس کے اندر شدید غیرت و حمیت بھی پائی جانی چاہئے۔ اسی کے ذریعہ ہم ہر دور میں حق و باطل کی آویزش، نیز آمیزش میں (جو بعض اوقات آویزش سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے) دینِ صحیح کی صراطِ مستقیم پر قائم بھی رہ سکتے ہیں اور اس کی خدمت و حفاظت کی سعادت و توفیق بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

{ بشکریہ البلاغ کراچی
اکتوبر نومبر ۱۹۸۲ء }

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ
یہ رشتہ فصلِ گُل و لالہ کا نہیں قائل
بہار ہو کہ خزاں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

القادر پرنٹنگ پریس فون : ۷۷۲۲۷۳۸